اُردو ادب کی

تنقیدی تاریخ

سیّد احتشام حسین

اُردو اَدب کی تنقید کی تاریخ

سیّد احتشام حُسین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک ۱ - آر کے پورم، نئی دہلی 110066

Urdu Adab ki Tanquidi Tarikh

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1983

چوتھا اڈیشن : 1999 تعداد 1100

قیمت: =/70

سلسلۂ مطبوعات:290

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

طابع : جے۔کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

1	اردو زبان اور ادب کی ابتدا	7
2	اردو دکن میں	24
3	دلّی اٹھارویں صدی میں	48
4	اردو نثر کی ابتدا اور تشکیل	74
5	اودھ کی دنیائے شاعری	83
6	نظیر اکبرآبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقا	112
7	قدیم دلّی کی آخری بہار	122
8	اُردو نثر: فورٹ ولیم اور اس کے بعد	138
9	نئے دور سے پہلے: نظم اور نثر	154
10	نیا شعور اور نیا نثری ادب	177
11	نشاۃ ثانیہ کی اردو شاعری	222
12	نظم میں نئی سمتیں	260
13	نثر کے نئے روپ	295
14	موجودہ ادبی صورت حال	329

چھٹا باب

نظیر اکبرآبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقا

یہاں تک پڑھ لینے کے بعد اس مختصر تاریخ کے قاری نے اس بات کا احساس ضرور کیا ہوگا کہ اگرچہ تاریخی اسباب کی بنا پر اُردو نے فارسی زبان اور اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی خیالات کا اثر قبول کیا مگر اُردو ادب میں اس کے باوجود مقامی رنگ اتنا گہرا رہا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس غیر ملکی اثر کے بہت سے تاریخی اسباب ہیں جو وقت کے حالات کا نتیجہ تھے اور اُن پر کسی کا بس نہیں تھا۔ مگر سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ اس رنگا رنگی میں بھی ہندوستانی تہذیب ایک طرح کی یک جہتی کا مظہر تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ اور نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں جاگیرداری دور کا زوال اور نئی طاقتوں کا طلوع نئے مسائل پیدا کر رہا تھا اور سیاسی تبدیلیوں نے ثقافت کی نشو و نما کو روک دیا تھا۔ اس لیے اس کے کسی حصّے میں ترقی نہیں دکھائی پڑتی۔ صرف شاہی دربار اور پایۂ تخت یا اس سے تھوڑا آگے بڑھ کر کچھ خاص خاص شہر ادب، فن اور ثقافت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ایسا ہر ملک میں اور ہر زمانے میں ہوتا ہے۔ زبان اس طرح ادبی ہو کر محدود ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ادب میں بھی کچھ مخصوص باتیں تسلیم کر لی جاتی ہیں اور انھیں توڑنے کی کوشش کرنے والے کو بھی اس کے زمانے میں اہمیت نہیں دی جاتی۔

اُردو نے بول چال کی زبان کی صورت میں ترقی کی، مگر جب اس نے ادب میں ایک مقام حاصل کر لیا تو اس کے ناپ تول کے پیمانے بدل گئے اور مرکزوں میں محدود ہو جانے کے باعث اس کا تعلق تھوڑا بہت عامۃ الناس سے ٹوٹ گیا۔ ادب پر تو ضرور ہی اس کا گہرا اثر پڑا۔ جیسا کئی مقامات پر اشارہ کیا جا چکا ہے اس وقت سماجی اور اقتصادی زندگی کے اصل دھارے دو تھے: ایک طرف عوام النّاس تھے جن میں بیشتر کسان اور نچلے درجہ کے عام لوگ تھے دوسری طرف بادشاہ، جاگیردار، فوج کے بڑے افسر اور دربار سے متعلق لوگ تھے جنھیں اونچا طبقہ کہا جا سکتا ہے۔ متوسط طبقہ ٹھیک سے پیدا نہیں ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ متوسط طبقے میں ہو سکتے تھے وہ بھی دماغی طور پر جاگیردارانہ زندگی سے متاثر تھے۔ اس لیے ادب میں بھی دو رنگ ہو جاتے ہیں جو کبھی کسی بڑے ادیب کی تخلیقات میں وسیع پیمانے پر ملتے دکھائی پڑتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب ادیب صرف اونچے طبقے کے لوگوں کے جذبات کی مصوّری کرتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا شعور شاہی دور کے خیالات۔ اخلاقی اصولوں، تعلیم سے متعلق قاعدوں سے بنتا تھا اور وہ انھیں روایات کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پھر بھی جہاں کہیں نوعِ انسانی کی بہبود اور پامال لوگوں کے ساتھ انصاف کا سوال اٹھتا تھا، یہ شاعر سب پابندیوں کو توڑ دیتے تھے۔ وہ مذہب، سیاسی روایات اور معاشی امتیازات کی مخالفت کرتے تھے، کیونکہ انھیں کی مدد سے انسان کو طبقوں اور گروہوں میں بانٹا جاتا تھا، یہ باتیں کچھ تو تصوّف کی بلند اور وسیع نظر کا نتیجہ کہی جا سکتی ہیں اور کچھ فرد اور سماج کے درمیان اخلاقی تعلق قائم کرنے کی کوشش میں پیدا ہوئیں۔ اس روایت کو چلانے میں سبھی عظیم شعراء کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ، ولی، میر، سراج، درد، آتش، غالب اور دوسرے شعراء اسی روایت کی پیروی کرتے تھے۔ اعلیٰ شعری ادب کی یہ خصوصیت سبھی زبانوں میں پائی جاتی ہے، کیونکہ انسان کے خلاف ناانصافی کا احساس صاحبِ دل شاعروں کو پہلے ہوتا ہے اور وہ ایک خاص طبقاتی سماج میں رہتے ہوئے بھی عام لوگوں کے ساتھ فراخدلانہ جذبہ ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اُردو میں اچھا عوامی ادب جنم نہیں لے سکا، اس کا سب سے

بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو زبان کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ہندوستانی ثقافت ایک مخصوص شکل اختیار کر چکی تھی، کئی زبانوں کے ادب رائج تھے اور جب اردو ایک نئی زبان کی شکل میں ابھری تو اس کے سامنے ادب کے جو اچھے نمونے موجود تھے، اس نے انھیں کی راہ اختیار کر لی۔ جب تک وہ بول چال کے کام میں لائی جاتی رہی اس نے عوام کے خیالات اور برتاؤ کی بنیاد پر ترقی کی اور بہت سے محاورے جو زندگی کے عام معمول سے تعلق رکھتے تھے، رائج ہو گئے۔ ابتدائی حالت میں اردو ادب میں سادگی تھی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ادبی زبان میں فارسی عربی الفاظ سے مدد لی جانے لگی اور زیادہ تر ان خیالات کا چرچا ہونے لگا جو ہندوستانی عوامی زندگی کے مزاج سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتے تھے۔ دیہی اور شہری زندگی میں فرق پیدا ہو چکا تھا اور شہروں میں بھی لوگ اپنے ہی طبقے کے لوگوں سے ملتے تھے اور اس بات کو اپنی آن بان کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتے تھے، اس طرح اردو شاعری عوامی ادب سے دور ہوتی چلی گئی۔

اُردو شاعری کے اس پہلو کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور طرف دھیان دینا سود مند ہوگا۔ اُردو کے بیشتر شاعر صرف فارسی زبان اور اس کے اصول شاعری کے واقف کار تھے، بلکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو فارسی کو اُردو سے برتر سمجھتے تھے اور اسی زبان میں لکھنے کو تہذیب کی علامت جانتے تھے۔ ان میں سے کچھ ہندی سے بھی واقف تھے، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندی اصول شاعری کے عالم تھے اس لیے وہ اپنی شاعری میں فارسی کے اصول شاعری اور اصول تنقید سے استفادہ کرتے تھے۔ فارسی کی تنقید شاعری پر ارسطو کا گہرا اثر پڑا تھا۔ اور اسی کی وجہ سے فارسی نقاد بھی اس اصول کو ماننے لگے تھے کہ شاعری اور تاریخ میں پیش ہونے والے واقعات میں فرق ہونا چاہیے۔ تاریخ میں خاص واقعات کا بیان ہوگا اور شاعری میں عمومی حیثیت کے اور عام واقعات کا، یہی سبب ہے کہ غزل میں، جو اُردو اور فارسی کے شعری ادب کی سب سے ہر دل عزیز ہیئت ہے، ایسے جذبات اور احساسات کا بیان ہوتا ہے، جو ایک ہی طرح کے بہت سے واقعات پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ اردو شاعری کی اس خصوصیت کو دھیان میں رکھنے سے کئی باتوں کے سمجھنے میں مدد ملے گی اور یہ بات بھی واضح ہو سکے گی کہ خاص واقعات اور مسائل پر زیادہ نظمیں کیوں نہیں لکھی گئیں۔ شاعری کو زیادہ

سے زیادہ عالمگیر اور آفاقی ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے یہ راہ پکڑی تھی۔ اس کے سماجی اور اقتصادی اسباب کا سمجھنا کچھ ایسا دشوار نہیں ہے مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بہت سے شاعر پوری طرح عوام کی عام زندگی سے واقف بھی نہ تھے۔ جن کو اس کا تھوڑا بہت تجربہ تھا اور جس طرح کا تجربہ تھا اس کا ذکر انھوں نے کسی نہ کسی طرح سے ضرور کیا ہے۔

ایسے ہی ایک شاعر نظیر اکبرآبادی ہیں جو اپنا کوئی مثل نہیں رکھتے۔ نظیر کی پیدائش دلّی میں ۱۷۴۰ء کے قریب ہوئی مگر ان کی پوری زندگی آگرہ (اکبرآباد) میں گذری، وہی آگرہ جو مغل شہنشاہ اکبر کی راجدھانی رہ چکا تھا اور جس کے چاروں طرف کرشن بھگتی کی وہ وشنو تحریک پھیلی ہوئی تھی جس نے سورداس اور میرابائی کے گیتوں اور بھجنوں کو جنم دیا تھا، جہاں عظیم الشان قلعہ اور تاج محل کھڑے کیے گئے تھے۔ یہاں کی ہوا میں رادھا اور کرشن کی محبت اور بھگتی کے گیت گونج رہے تھے، جہاں سے قریب متھرا اور برندابن کے میلوں اور تہواروں میں شریک ہوکر عوام کے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی تھی۔ ان روایات کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نئے معاشی حالات کے زیر اثر ہندوستان غریب ہوتا جارہا تھا، تاجر اور اہلِ حرفہ بیکار ہورہے تھے۔ ملک کی دولت سمندر پار جارہی تھی اور دیہی زندگی کا وہ ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا جو صدیوں سے ملک کی زندگی کو باندھے ہوئے تھا۔ نظیر اکبرآبادی کی عمر اسی آگرے میں کٹی جس کے ذرہ ذرہ سے انھیں محبت تھی خود کہتے ہیں:

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے
ملا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے
شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

اس لیے ان کی شاعری میں وہی زندگی سانس لیتی معلوم ہوتی ہے، جو آگرے میں اور اور اس کے چاروں طرف تھی۔

نظیر کا نام ولی محمد تھا۔ حسب رواج انھوں نے فارسی عربی پڑھی تھی مگر انھیں ان زبانوں کا بڑا عالم نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ لڑکوں کے پڑھانے میں

گزارا۔ آخر میں لالہ بلاس رائے کے لڑکوں کو سترہ روپے ماہوار پر فارسی پڑھانے لگے تھے۔ ایک وقت کا کھانا انھیں کے یہاں کھاتے تھے۔ جوانی میں زندگی کے عیش و آرام، تفریح اور مذاق سب میں حصہ لیا تھا، کھیل کود، کنکوے بازی، تیراکی، کسرت کشتی، کبوتر بازی سبھی دلچسپیوں سے جی بہلاتے رہے تھے۔ مسلمانوں اور ہندؤں کے تہواروں خاص کر ہولی و دیوالی، راکھی، کرشن جنم میں ضرور حصہ لیتے تھے۔ بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اودھ اور بھرت پور کے شاہی درباروں سے دعوت نامے ملے مگر انھوں نے آگرے کو چھوڑنا منظور نہیں کیا اور نفع یا سکون کی زندگی کو ٹھکرا دیا دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی قربانی ہے مگر درحقیقت یہ عوامی زندگی سے محبت اور وہ وابستگی ہے جو دربار سے بندھ جانے کے بعد ختم ہو جاتی۔

نظیر نے ایک طویل عمر پائی۔ اس میں انھوں نے آرام بھی اٹھایا اور زندگی کے دکھ بھی سہے۔ اس میں وہ محبت کی پینگوں میں بھی جھولے اور فقیروں کی ایسی زندگی بھی گذاری۔ آگرے کے بڑے بڑے لوگ ان کی توقیر و تعظیم کرتے تھے اور استحصال کا شکار مختلف طبقات کے عوام سے بھی اُن کا یارانہ تھا۔ یہ تعلق اتنا مضبوط تھا کہ ان کے یہاں اونچ نیچ، ہندو مسلم، چھوٹے بڑے کا امتیاز مٹ گیا تھا۔ ان کے مزاج میں ایسی سادگی اور برتاؤ میں ایسی بے ریائی پائی جاتی تھی کہ سبھی ان کے دوست تھے۔ بھکاری اور خوانچے والے بھی ان سے اپنے لیے نظمیں لکھا لیتے تھے۔ آگرہ کے محلہ تاج گنج میں رہتے تھے۔ وہیں ۱۸۳۰ء میں ان کی وفات ہوئی اور گھر ہی کے اندر اُن کی قبر بنی۔ نظیر ایسے خدا پرست تھے کہ ان کی وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے انھیں بڑا صوفی فقیر سمجھا اور بہت دنوں تک ان کی قبر پر ہر سال میلہ لگتا رہا۔ ان کے بیٹے خلیفہ گلزار علی اسیر بھی شاعر تھے۔ کئی شاگرد بھی تھے جن میں باطن کو شہرت حاصل ہے، انھوں نے شعرا کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا جس میں نظیر کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے کیونکہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے انھیں بازاری شاعر سمجھ کر نظر انداز کیا تھا۔

نظیر کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ایک میں ان کی نظمیں ہیں اور اس کا نام کلیاتِ نظیر ہے۔ یہ دیوان بار بار چھپ چکا ہے۔ ہندی میں بھی اس کے کچھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرا دیوان ابھی کچھ برس پہلے دستیاب ہوا۔ اس میں صرف غزلیں ہیں۔ اسے بھی

شائع کر دیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ ابھی ان کی بہت سی نظمیں لوگوں کے پاس ادھر اُدھر ہیں۔ مگر یقینی طور سے اس بارے میں کچھ کہنا ناممکن ہے۔ دوسرا مجموعہ ملنے سے یہ تو ہوا کہ ہم نظیر کی غزلوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں مگر آج بھی انھیں ہندوستانی ادبیات میں جو عظمت حاصل ہے وہ نظموں ہی کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس میں ہندوستانی زندگی اپنی تمام اچھائیوں اور بُرائیوں کے ساتھ جی اٹھی ہے۔ اس کلیات کا ایک حصّہ کرشن جی، مہادیو جی، بھیروں جی وغیرہ پر لکھی ہوئی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔ نظیر سے پہلے زیادہ تر شعراء عام موضوعات پر لکھتے اور عوام کی زندگی کی تصویر کشی کرنے میں ہچکتے تھے مگر نظیر نے اونچے طبقے کے خیالات میں ایک ایسا چور دروازہ بنا دیا جس میں سے ہو کر عوام کا جلوس قصرِ ادب میں گھس آیا۔ شاعری کی اس عظیم روایت کے ساتھ نظیر اکبرآبادی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اصل میں تو یہ وہی روایت تھی جسے امیر خسرو نے جنم دیا تھا مگر درمیان میں زندگی سے اس کا وہ پہلا سا گہرا تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ نظیر نے اسے مستحکم وسیع اور مقبول عام بنایا۔ امیر خسرو کے بعد صوفی شعراء نے، گولکنڈہ کے قلی قطب شاہ نے، جعفر زٹلی نے دلّی کے فائز اور حاتم نے اسے ہلاکت سے بچایا تھا، نظیر نے اسے آسمان تک بلند کر دیا۔

ایک ہندی ادیب نے نظیر کی فراخدلی اور اردو ادب کی ایک نئی روایت نکالنے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"۔۔۔ اس خٹک اور اجاڑ سنگم پر آکر نظیر نے اذان بھی دی اور سنکھ بھی پھونکا، تسبیح بھی لی اور جنیو بھی پہنا، محرم میں روئے تو ہولی میں بھانڈ بھی بنے، رمضان میں روزے رکھے تو سلونوں پر راکھی باندھنے کو مچل پڑے، شبرات پر مہتابیاں چھوڑیں تو دیوالی پر دیپ سجائے، نبی، رسول، ولی، پیر، پیغمبر کے لیے جی بھر کے لکھا، تو کرشن، مہادیو، نرسی، بھیروں اور نانک کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا۔ گل و بلبل پر کہا تو آم اور کوئل کو پہلے یاد رکھا۔ پردے کے ساتھ بسنتی ساڑھی بھی یاد رہی۔ اور تو اور گرمی، برسات اور سردی پر بھی لکھا۔ بچوں کے لیے ریچھ کا بچہ، کوّا اور ہرن، گلہری کا بچہ، تربوز، کنکوے بازی، بلبلوں کی لڑائی، ککڑی، تیراکی، تل کے لڈوؤں پر لکھنے بیٹھے تو بچہ بن گئے، ہر ایک بچہ گلی کوچے میں گاتا پھر رہا ہے۔ جوانوں اور بوڑھوں کو پند دینے بیٹھے تو لوگ وجد میں آگئے۔ جیسے قرآن،

حدیث، وید، گیتا، اپنشد، پران، سب گھول کر پی جانے والا کوئی پہونچا ہوا
بزرگ بول رہا ہو[1]"

یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ نظیر کے یہاں اُردو شاعری کی وہ روایات بالکل نہیں ہیں جنھیں سامنتی تہذیب اور ایرانی اثرات نے جنم دیا تھا اور نہ یہی کہنا ٹھیک ہوگا کہ دورِ حاضر کی حقیقت پسندی اور قومی شعور کا آغاز نظیر کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں ناممکن تھیں مگر ان کی شاعری میں جو سچائی، جو وطن پرستی، عام زندگی کی جو واقفیت، انسان کی جو محبت، جو وسعت قلب اور جو سادگی ملتی ہے وہ اس سے پہلے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی تھی۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم قدم جمائے زمین پر کھڑے ہیں ہمارے چاروں طرف انسان بے کھٹکے چل پھر رہے ہیں، اپنے دیس کے جاڑے، گرمی، برسات آتے ہیں اور ہم ان جانے بوجھے موسموں کا لطف اُٹھانے لگتے ہیں۔ الگ الگ گروہوں اور ذاتوں کے لوگ متعدد مذہبوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے، جانور، چڑیاں سب موجود ہیں اور ساری فضا وہ ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ ان چھوٹے موضوعات پر زندہ نظمیں لکھنا کسی معمولی یا چھوٹے شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جس کا دل ہمدردی سے لبریز، مشاہدہ گہرا اور عام زندگی کا احساس قوی ہو۔ نظیر میں یہ ساری باتیں موجود تھیں۔ نظیر کے تجربے کا میدان اتنا وسیع ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی کے بارے میں سبھی کچھ جانتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ نظیر کے پاس کوئی عمیق فلسفیانہ نظر نہیں ہے مگر وہ زندگی کے مسائل میں اس طرح رسے بسے ہوئے ہیں کہ انھیں سب باتیں اپنے آپ معلوم ہیں۔ وہ مفلسی کے اسباب، زندگی اور مذہب کے تعلق، طبقات کے اختلاف، انسانیت کی ضروریات، سب کچھ جانتے ہیں اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی سیدھی سادھی نظموں میں یہ تمام باتیں کیسے سماگئی ہیں۔ جب وہ برسات، آندھی، اندھیری رات آٹا دال، تیراکی وغیرہ پر لکھتے ہیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ باتیں ان کے منھ سے نکل رہی ہیں، بلکہ ان کو انھوں نے ہر موقع اور ہر نگاہ سے دیکھا ہے۔ انھوں نے زندگی کو جیسا دیکھا اور پایا تھا ویسی ہی اس کی مصوری کردی، لیکن ہر محل پر ان کا نقطۂ نظر عوام کا

[1] شعر و شاعری مصنفہ ایودھیا پرشاد گویلیہ ۱۹۳۸ء

نقطۂ نظر رہا ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ وہ ملک کے معاشی مسائل کو سائنسی طریقے سے نہیں جانتے تھے، طبقات کے داخلی تصادم کا کوئی خاص علم نہیں رکھتے تھے مگر ایک سچے انسان دوست ہونے کے باعث وہ عوام کے دُکھ سُکھ کا اندازہ لگا لیتے تھے کیونکہ وہ انھیں میں سے ایک تھے۔

نظیر کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت اُن کی زبان پر خاص طور سے توجہ کرنی چاہیے کیونکہ اُن کی زبان آگرہ کی بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے۔ اس میں کہیں کہیں کھڑی بولی اور برج کا میل ہے۔ ایک آدھ نظموں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی، فارسی کے علاوہ اودھی اور پنجابی بھی جانتے تھے۔ اختصار کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام عظیم شعراء کی طرح زبان کا استعمال نظیر کی شخصیت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ فن کی نظر سے ان کی شاعری میں نقائص ہیں تخیل کی نظر سے طرح طرح کی سخت ناہمواریاں ہیں مگر ان کی صداقت اور انسانیت دوستی سب پر پردہ ڈال دیتی ہے، اور ان کی نظمیں پڑھتے ہوئے بند اور رندھے ہوئے ماحول سے نکل کر ہم کھلی ہوا میں آجاتے ہیں۔ نمونے کے لیے کچھ نظموں کے اجزا دیے جاتے ہیں:

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں — اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی — اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی — چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(آدمی نامہ)

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی — کوٹھے کی چھت نہیں ہے، یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی — ہر گھر میں اس طرح سے پھر آئی ہے مفلسی

پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جو ایک بار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ ۔ آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے بُرے وقت سے پناہ ۔ وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ

کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار ۔ دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب اُدھار
بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بیشمار ۔ بیٹھے ہیں یوں دکانوں پہ اپنی دُکاندار

جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

قسمت سے چار پیسے جنھیں ہاتھ آتے ہیں ۔ البتہ روکھی سوکھی وہ روٹی پکاتے ہیں
جو خالی ہاتھ آتے ہیں وہ قرض لیکے جاتے ہیں ۔ یوں بھی نہ پایا کچھ تو فقط غم کو کھاتے ہیں

سوتے ہیں کر کواڑ کو اک آہ مار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات ۔ سب پر پڑی ہے آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات ۔ روزی کے اب درخت کا ملتا نہیں ہے پات

ایسی ہوا کچھ آکے ہوئی ایک بار بند

(شہر آشوب)

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی ۔ کس کس طرح سے اُس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی ۔ بھوکا تمام رات سُلاتی ہے مفلسی

یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر ۔ دیتا ہے اپنی جان وہ اک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر ۔ جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر

ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

(مفلسی)

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دو بالا ہوتا ہے
سب بات بپتا کی بھولے ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند منڈلی باجت ہے نت بھون اجالا ہوتا ہے

یوں نیک نچھر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

شبھ ساعت سے یوں دنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں
جو نار دمنی ہے دھیان بھلی سب اس کا بھید بتاتے ہیں
وہ نیک مہورت سے جس دم اس سرشٹ میں جنمے جاتے ہیں
جو لیلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ دکھلا جاتے ہیں

یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں
پر بالے ہی پن میں اُن کے اچار نرالے ہوتے ہیں
(جنم کنھیا جی)

یہاں نظیر کی اس سے زیادہ نظمیں دینا ممکن نہیں ہے۔ مگر اس باب کو تمام کرنے سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ نظیر کی شعر گوئی کا بیان الگ سے ایک باب میں اسی لیے کیا گیا ہے کہ تھوڑا بہت رسمی اور مروّج شاعری کی پیروی کرنے کے بعد بھی نظیر نے اپنا طرز سب سے الگ نکالا، وہ نہ دلّی کے مرکز میں رکھے جا سکتے ہیں اور نہ لکھنؤ کے مرکز میں، وہ خود نئی روش کے موجد ہیں اور کسی بنے بنائے راستے پر چلنے کے بجائے اپنی راہ آپ بنانے والے۔ یہ خصوصیت انھیں اس لیے حاصل ہوئی تھی کہ انھوں نے زندگی کے سمجھنے میں کسی فلسفہ یا روایت کا سہارا نہیں لیا بلکہ اس میں خود ڈوب گئے اور وہ لکھا جو کسی اور نے نہیں لکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وقت میں نقادوں نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی اور وہ طرز رائج نہ ہو سکا جسے نظیر نے اپنایا تھا۔ مگر آج ان کا اثر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اُردو کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی اور مشہور شاعر احسان دانش صرف اُن کی بڑائی کو ہی نہیں مانتے بلکہ ان سے متاثر بھی ہیں۔ آج کے نقاد بھی قدیم تذکرہ نویسوں کے برعکس انھیں بلند مقام دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جدید نقطۂ نظر سے شاعری اور زندگی میں جس رشتے کی تلاش کی جا رہی ہے اس کے خوبصورت نمونے نظیر کے یہاں ملتے ہیں اور وہ روایت درخشاں ہو کر راہ نمائی کرتی ہے جس پر چلے بغیر ادب ایک چھوٹے سے دائرہ میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔